تفہیم القرآن

(۳۹)

یوسف

(از ابتدا تا رکوع ۵)

اس سورہ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانۂ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہو گی جبکہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں یا جلاوطن کریں یا قید کر دیں۔ اُس زمانہ میں بعض کفار مکہ نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہوا۔ چونکہ اہل عرب اس قصہ سے ناواقف تھے، اس کا نام ونشان تک ان کے ہاں کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا، اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی ان کا ذکر نہ سنا گیا تھا، اس لیے انھیں توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے، اور اس طرح آپ کا بھرم کھل جائے گا۔ لیکن اس امتحان میں انھیں الٹی منہ کی کھانی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ اپنے نبی پر الہام فرما دیا، بلکہ مزید برآں ٹھیک اس موقع پر جبکہ یہ لوگ آپ کے ساتھ برادران یوسفؑ کا سا معاملہ کر رہے تھے، اس قصے کو ان پر چسپاں بھی کر دیا۔

پس یہ قصہ دو اہم مقاصد پر مشتمل ہے:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور ان کے خود تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ آپ سنی سنائی

باتیں بیان نہیں کرتے بلکہ فی الواقع آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو سورہ کی تمہید میں بھی صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے اور خاتمۂ کلام پر بھی پورے زور کے ساتھ اس کی تصریح کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ سرداران قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اُس وقت جو معاملہ چل رہا تھا اس پر برادران یوسفؑ اور یوسف علیہ السلام کے قصے کو چسپاں کرتے ہوئے قریش والوں کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا، مگر جس طرح وہ خدا کی مشیت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار اسی بھائی کے قدموں میں آ رہے جس کو انھوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنوئیں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمھاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور ایک دن تمھیں بھی اپنے اسی بھائی سے رحم و کرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ مقصد بھی سورہ کے آغاز اور اختتام، دونوں میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے، چنانچہ آغاز میں فرمایا کہ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ (یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں) اور آخر میں فرما دیا کہ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (ان کے حالات میں ذی ہوش لوگوں کے لیے ایک عبرت آموز سبق ہے)۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کے قصے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے قرآن مجید نے گویا ایک صریح پیشینگوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس سورہ کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ قریش والوں نے برادران یوسف کی طرح محمد صلی اللہ علیہ کے قتل کی سازش کی اور آپ کو مجبوراً ان سے جان بچا کر مکّے سے نکلنا پڑا۔ پھر ان کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو بھی جلاوطنی میں ویسا ہی عروج و اقتدار نصیب ہوا جیسا یوسف علیہ السلام کو ہوا تھا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک ٹھیک

وہی کچھ پیش آیا جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائیوں کی آخری حضوری کے موقع پر پیش آیا تھا۔ وہاں جب برادران یوسف انتہائی عجز و درماندگی کی حالت میں ان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ، "ہم پر صدقہ کیجئے اللہ صدقہ کرنے والوں کو نیک جزا دیتا ہے"، تو یوسف علیہ السلام باوجودیکہ ان کے ظلم و ستم کا انتقام لینے پر پوری طرح قادر تھے مگر آپ نے یہ کہہ کر انہیں معاف کر دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔ اسی طرح یہاں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے اور آنحضرت ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپ نے ان سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟" انہوں نے عرض کیا اخ کریم وابن اخ کریم "آپ ایک عالی ظرف بھائی ہیں، اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں"۔ اس پر آپ نے فرمایا فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوته، لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء۔ "میں تمہیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تمہیں معاف کیا"۔

یہ دو پہلو تو اس سورہ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قصے کو بھی قرآن مجید محض قصہ گوئی و تاریخ نگاری کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق وہ اسے اپنی اصل دعوت کی تبلیغ میں استعمال کرتا ہے۔

وہ اس پوری داستان میں یہ بات نمایاں کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی چیز کی طرف وہ بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے کردار اور دوسری طرف برادران یوسف

قافلۂ تجار، عزیزِ مصر، اس کی بیوی، بیگماتِ مصر، اور حکامِ مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے اور محض اپنے اندازِ بیان سے سامعین و ناظرین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام، یعنی خدا کی بندگی اور حسابِ آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت، اور دنیا پرستی اور خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتے ہیں، اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں سے کس نمونے کو پسند کرتا ہے۔

پھر اس قصے سے قرآنِ حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا مگر نتیجہ میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کو کنوئیں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا، مگر فی الواقع انھوں نے یوسفؑ کو اس بامِ عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا، اور اپنی اس حرکت سے انھوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسفؑ کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے انھیں ندامت و شرمساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ عزیزِ مصر کی بیوی یوسفؑ کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو ان سے انتقام لے رہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تختِ سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے ملک کی مربیہ کہلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنے اعترافِ خیانت کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے

بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی، بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور ان لوگوں کے حصہ میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنھوں نے اسے گرانا چاہا تھا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس، خدا جسے گرانا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی، بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں الٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اس حقیقت حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدابیر، دونوں میں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانون الٰہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی و ناکامی تو اللہ کے ہاتھ ہے، لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا وہ اگر ناکام بھی ہوا تو بہرحال ذلت و رسوائی سے دوچار نہ ہوگا، اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا وہ آخرت میں تو یقیناً رسوا ہوگا ہی مگر دنیا میں بھی اس کے لیے رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔ دوسرا اہم سبق اس سے توکل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کا ملتا ہے۔ جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دنیا انھیں مٹا دینے پر تلی ہوئی ہو وہ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو انھیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہوگی، اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دیے چلے جائیں گے۔

اس قصے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی و جغرافی معلومات بھی ناظرین کے پیش نظر رہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب کے بیٹے، حضرت اسحاقؑ کے پوتے، اور حضرت ابراہیم کے پرپوتے تھے۔ توراۃ کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ ان میں سے حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے، اور باقی دس دوسری بیویوں سے تھے۔ فلسطین میں حضرت یعقوب کی جائے قیام حبرون کی وادی میں تھی

جہاں حضرت اسحٰق اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب کی کچھ زمین سِکم میں بھی تھی۔ بائبل کے علماء کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسف کی پیدائش سنہ ۱۹۰۶ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور سنہ ۱۸۹۰ ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس قصہ کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنویں میں پھینکا جانا

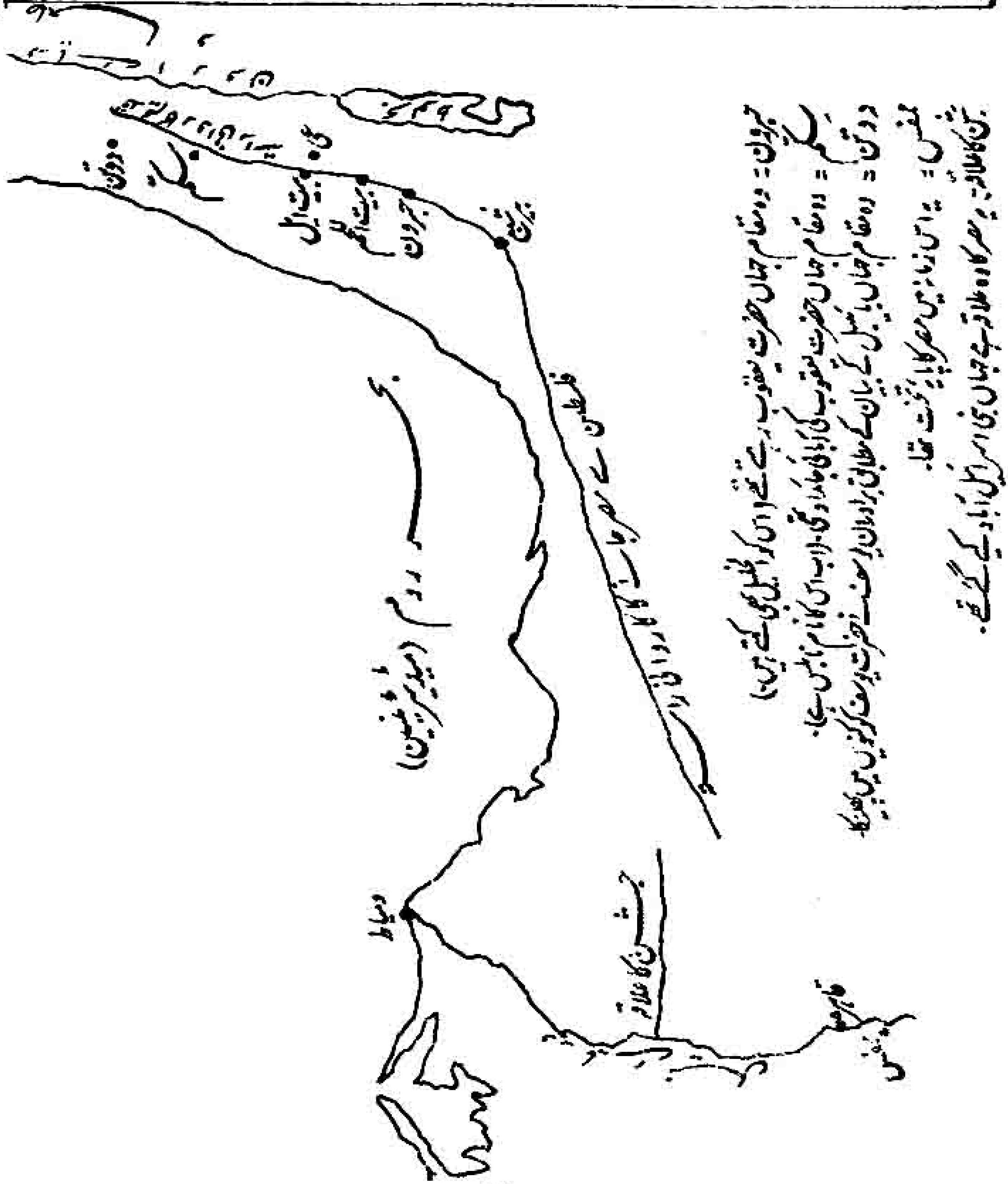

اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی۔ جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے وہ بائیبل اور تلمود کی روایات کے مطابق سکم کے شمال میں دوتن کے قریب واقع تھا، اور جس قافلے نے انھیں کنوئیں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آرہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر پر اس زمانہ میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ شام کے رہنے والے سامی النسل تھے۔ عرب مورخین اور مفسرین قرآن نے ان کے لیے "عمالیق" کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب سے انھیں وہاں اپنی بادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسف کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ اس کے علاوہ مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رواج پائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو "فرعون" کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ "فرعون" مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بائیبل میں غلطی سے اس کو بھی "فرعون" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ "فراعنہ" ہی تھے۔

موجودہ زمانہ کے محققین، جنھوں نے بائیبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرمانروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں ممفس تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل

کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ جب حضرت یوسف مصر کے حکمراں ہوئے تو انھوں نے حضرت یعقوب کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلالیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بائیبل اور تلمود میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، اگر قصے کے اہم اجزا میں تینوں متفق ہیں۔ ہم اپنے حواشی میں حسب ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ا ل ر۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن[1] بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔[2] اے محمدؐ، ہم اس قرآن

---

[1] قرآن مصدر ہے قرأ یقرأ سے۔ اس لیے اس کے اصل معنی ہیں "پڑھنا"۔ مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنی مصدری بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کسی شخص کو ہم بہادر کہنے کے بجائے "بہادری" کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر شجاعت ایسی کمال درجے کی پائی جاتی ہے کہ گویا وہ اور شجاعت ایک چیز ہیں۔ پس اس کتاب کا نام "قرآن" (پڑھنا) رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عام و خاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

[2] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب خصوص طور پر اہل عرب ہی کے لیے نازل کی گئی ہے، بلکہ اس فقرے کا اصل مدعا یہ ہے کہ اے اہل عرب، تمھیں یہ باتیں کسی یونانی یا ایرانی زبان میں تو نہیں سنائی جارہی ہیں، تمھاری اپنی زبان ہی میں ہیں، لہٰذا تم نہ تو یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ یہ باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کتاب میں اعجاز کے جو پہلو ہیں، جو اس کے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، وہ تمھاری نگاہوں سے پوشیدہ رہ جائیں۔

بعض لوگ قرآن مجید میں اس طرح کے فقرے دیکھ کر یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ یہ کتاب تو اہل عرب کے لیے ہے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

کو تمہاری طرف وحی کرکے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے) تم بالکل ہی بے خبر تھے [۵]

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ "ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں اور دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔" جواب میں اس کے باپ نے کہا، "بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے۔ [۶] ہوشیار رہنا کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) غیر اہل عرب کے لیے نازل ہی نہیں کی گئی ہے، پھر اسے تمام انسانوں کے لیے ہدایت کیسے کہا جا سکتا ہے؟" لیکن یہ محض ایک سرسری سا اعتراض ہے جو حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر جڑ دیا جاتا ہے۔ انسانوں کی عام ہدایت کے لیے جو چیز بھی پیش کی جائے گی وہ بہرحال انسانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان ہی میں پیش کی جائے گی، اور اس کے پیش کرنے والے کی کوشش یہی ہوگی کہ پہلے وہ اس قوم کو اپنی تعلیم سے پوری طرح متاثر کرے جس کی زبان میں وہ اسے پیش کر رہا ہے، پھر وہی قوم دوسری قوموں تک اُس تعلیم کے پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ یہی ایک فطری طریقہ ہے کسی دعوت و تحریک کے بین الاقوامی پیمانے پر پھیلنے کا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] اس سورہ کے دیباچہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کفارِ مکہ میں سے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے، بلکہ اپنے نزدیک آپ کا بھرم کھولنے کے لیے، غالباً یہودیوں کے اشارے پر، آپ کے سامنے اچانک یہ سوال پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے مصر پہنچنے کا کیا سبب ہوا۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ باب پیش کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر یہ فقرہ ارشاد ہوا ہے کہ اے محمد، تم ان واقعات سے بے خبر تھے، دراصل یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعہ سے تمہیں ان کی خبر دے رہے ہیں۔ بظاہر اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل میں روئے سخن ان مخالفین کی طرف ہے جن کو یقین نہ تھا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

[۶] اس سے مراد حضرت یوسف کے وہ دس بھائی ہیں جو دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوب کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسف سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انہیں کچھ تامل ہو، اس لیے انہوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب تھا کہ سورج سے مراد حضرت یعقوب، چاند سے مراد ان کی بیوی (حضرت یوسف کی سوتیلی والدہ) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں،

کرے گا[۱] اور تجھے باتوں کی تہ کو پہنچنا سکھائے گا[۲] اور تیرے اوپر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کریگا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے دادا اور پردادا ابراہیم اور اسحٰق پر کرچکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جب انھوں نے آپس میں کہا کہ "یوسف اور اس کا بھائی[۴]، دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں

---

[۱] یعنی نبوت عطا کرے گا۔

[۲] "تَاوِیْلَ الْاَحَادِیْث" کا مطلب محض تعبیرِ خواب کا علم نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی، اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تو ہر معاملہ کی گہرائی میں اترنے اور اس کی تہ کو پالینے کے قابل ہو جائے گا۔

[۳] قرآن مجید کا یہ بیان بائیبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ اُن کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ یہ خواب سن کر بیٹے کو خوب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت یعقوب کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے بہ نسبت توراۃ و تلمود کا۔ حضرت یوسف نے خواب بیان کیا تھا، کوئی اپنی تمنا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس کی جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب ہی سمجھ کر نکالی تھی، تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر برا مانے اور خواب دیکھنے والے کو الٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے آئندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے الٹا جل بھن جائے؟

[۴] اس سے مراد حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمین ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوب ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت ممدوح کی ساری اولاد میں صرف ایک یوسفؑ ہی ایسے تھے جن کے اندر آپ کو آثار رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اوپر حضرت یوسف کا خواب سن کر حضرت یعقوب نے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں، صاف نظر آتا ہے کہ ابا جان بہک گئے ہیں۔[۱] چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام ہو جانے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔[۲] ان میں سے ایک نے کہا "یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو، کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا"۔ اس قرارداد پر انھوں نے جا کر اپنے باپ سے کہا "ابا جان! کیا بات ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا اندازہ بھی آگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادران یوسف کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے الٹا الزام حضرت یوسف پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف بھائیوں کی چغلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کوئی منظم ریاست موجود نہیں ہوتی اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں، وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے کتنے ہیں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت، فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں کام آ سکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بھائیوں نے کہا کہ ہمارے والد بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں، ہم جوان بیٹوں کا جتھا، جو برے وقت ان کے کام آ سکتا ہے، ان کو اتنا عزیز نہیں ہے جتنے یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ان کے کسی کام نہیں آ سکتے بلکہ الٹے خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

[۲] یہ فقرہ ان لوگوں کے نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو خواہشات نفس کے حوالے کر دینے کے ساتھ ایمان اور نیکی سے بھی کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نفس ان سے کسی برے کام کا تقاضا کرتا ہے تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے اس کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسے مواقع پر اپنے نیم جان ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دے دیا کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر، یہ ناگزیر گناہ، جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے، کر گزرنے دے، پھر ان شاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے کچھ چر چُگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں"۔لہ باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے کوئی بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ انھوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھا لیا، جبکہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے"۔ اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے اس فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں"۔تہ شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "ابا جان ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا

لہ یہ بیان بھی بائیبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سِکم کی طرف گئے ہوئے تھے اور بعد میں حضرت یعقوب نے خود ان کی تلاش میں حضرت یوسف کو بھیجا تھا۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے حسد کا حال جاننے کے باوجود انھیں آپ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بھیجا ہو۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

تہ متن میں وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کے الفاظ کچھ ایسے انداز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر کیا وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کی یہ حرکت انھیں جتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انھیں وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے بوجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائیبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایک ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو ایک جلیل القدر منصب کے لیے نامزد ہو چکا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا

(باقی صفحہ ۱۹۱ پر)

اگر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں"۔ اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا[ا] اور بخوبی کروں گا جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔[۲]

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقے نے جو کنوئیں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ) وہ پکار اٹھا "مبارک ہو، یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا[۳] اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے؟ ۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنوئیں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا اس موقع پر کرے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [ا] متن میں "صبر جمیل" کے الفاظ ہیں جس کا لفظی ترجمہ "اچھا صبر" ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، جزع فزع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آ پڑی ہو۔

[۲] بائبل اور تلمود یہاں حضرت یعقوب کے تاثر کا نقشہ بھی ایسے انداز سے کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ "تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا"۔ اور تلمود کا بیان ہے کہ "یعقوب بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے ...... اور وہ سالہا سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا"۔ اس نقشے میں حضرت یعقوب وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس میں ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار و باوقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھی بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے، اور پھر عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر بھی کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ بھی کرتا ہے۔

(حاشیہ [۳] صفحہ ۲۰ پر)

مصر میں جس شخص نے اسے خریدا[۱] اس نے اپنی بیوی[۲] سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) ۳۰ اس سے معاملہ کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسف کو کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے، بعد میں قافلے والوں نے ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائیبل کا بیان ہے کہ برادران یوسف نے بعد میں اسماعیلیوں کے ایک قافلے کو دیکھا اور چاہا کہ یوسف کو کنویں سے نکال کر ان کے ہاتھ بیچ دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی مدین کے سوداگر انھیں کنویں سے نکال چکے تھے۔ ان سوداگروں نے حضرت یوسف کو بیس روپے میں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر آگے چل کر بائیبل کے مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر وہ اسماعیلیوں کے ہاتھ حضرت یوسف کو فروخت کرا چکے ہیں، چنانچہ وہ اسماعیلیوں کے بجائے پھر مدین ہی کے سوداگروں سے مصر میں انھیں دوبارہ فروخت کراتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۳۷، آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶)۔ اس کے برعکس تلمود کا بیان یہ ہے کہ مدین کے سوداگروں نے یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا، پھر برادران یوسف نے حضرت یوسف کو ان کے قبضہ میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا، آخر کار انھوں نے ۲۰ درہم قیمت ادا کر کے برادران یوسف کو راضی کیا۔ پھر انھوں نے بیس ہی درہم میں انھیں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر انھیں فروخت کیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادران یوسف نے حضرت یوسف کو فروخت کیا تھا۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اس روایت کی تائید نہیں کرتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ بائیبل میں اس شخص کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ قرآن مجید آگے چل کر اسے "عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور پھر ایک دوسرے موقع پر یہی لقب حضرت یوسف کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بہت بڑا عہدہ دار یا صاحب منصب تھا، کیونکہ "عزیز" کے معنی ایسے با اقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جا سکتی ہو۔ بائیبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا، اور ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہی خزانے کا افسر تھا۔

۲؎ تلمود میں اس عورت کا نام زَلیخا (Zelicha) لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا ہے۔ مگر یہ بات بالکل بے اصل ہے کہ بعد میں حضرت یوسف سے اس عورت کا نکاح ہوا۔ اس کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ اسرائیلی تواریخ میں۔ اور ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اس کو ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔

لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں[۱۱]۔" اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا[۱۲]۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔

---

[۱۱] تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر ۱۸ سال کی تھی اور فوطیفار ان کی شاندار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ جب وہ انھیں خرید رہا تھا اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ غلام تو نہیں معلوم ہوتا، مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چرا لائے ہو۔ اسی بنا پر فوطیفار نے ان سے غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے گھر اور اپنی کل املاک کا مختار بنا دیا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ "اس نے اپنا سب کچھ یوسف کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سوا روٹی کے جسے وہ کھا لیتا تھا اسے اپنی کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔" (پیدائش ۳۹ - ۶)

[۱۲] حضرت یوسف کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم ریاست تھی اور نہ تمدن و تہذیب نے کوئی بڑی ترقی کی تھی۔ کچھ آزاد قبائل تھے جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے، اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بنا لی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے پہلو میں قریب قریب وہی تھا جو آج کل ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر آزاد علاقہ کے قبائل کا ہے۔ یہاں حضرت یوسف کو جو تعلیم و تربیت ملی تھی اس میں بدویانہ زندگی کے محاسن اور خانوادۂ ابراہیمی کی خدا پرستی و دینداری کے عناصر تو ضرور شامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ اس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک، یعنی مصر میں ان سے جو کام لینا چاہتا تھا، اور اس کے لیے جس واقفیت، جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی اس کے نشوونما کا کوئی موقع بدوی زندگی میں نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انھیں سلطنت مصر کے ایک بڑے عہدے دار کے ہاں پہنچا دیا اور اس نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں اپنے گھر اور اپنی جاگیر کا مختار کل بنا دیا۔ اس طرح یہ موقع پیدا ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں جو اب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں، اور انھیں ایک چھوٹی جاگیر کے انتظام سے وہ تجربہ حاصل ہو جائے جو آئندہ ایک بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانے کے لیے درکار تھا۔ اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا[1]۔ اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اُس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آجا"۔ یوسفؑ نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"[2]۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی

---

[1] قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم "نبوت عطا کرنا" ہوتا ہے۔ "حکم" کے معنی قوت فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی عطا کی اور اختیارات بھی تفویض فرمائے۔ رہا "علم" تو اس سے مراد وہ خاص علم حقیقت ہے جو انبیاء کو وحی کے ذریعہ سے براہ راست دیا جاتا ہے۔

[2] عام طور پر مفسرین اور مترجمین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں میرے رب کا لفظ حضرت یوسفؑ نے اُس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جس کی ملازمت میں وہ اُس وقت تھے اور ان کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میرے آقا نے تو مجھے ایسی اچھی طرح رکھا ہے، پھر میں یہ نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے زنا کروں۔ لیکن مجھے اس ترجمہ و تفسیر سے سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عربی میں لفظ رب "آقا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ بات ایک نبی کی شان سے بہت گری ہوئی ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔ اور قرآن میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ کسی نبی نے خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب کہا ہو۔ آگے چل کر خود اسی سورہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے اور مصریوں کے مسلک کا یہ فرق بار بار واضح فرماتے ہیں کہ ان کا رب تو اللہ ہے اور مصریوں نے بندوں کو اپنا رب بنا رکھا ہے۔ پھر جب آیت کے الفاظ میں یہ مطلب لینے کی بھی گنجائش موجود ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ربی کہہ کر اللہ کی ذات مراد لی ہو، تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک ایسے معنی کو اختیار کریں جس میں صریحًا قباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

دلیل نہ دیکھ لیتا۔[۵] ایسا ہوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں،[۶] درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسف اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا

۵ ۔ رب کی دلیل سے مراد وہی بات ہے جو اوپر حضرت یوسف نے اس عورت کی دعوتِ عیش کے جواب میں فرمائی تھی کہ "میرے ربّ نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی"۔ یہی وہ برہانِ رب تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ "یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا" تو اس سے عصمتِ انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ، اور لغزش و خطا کی استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود، اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے دل و دماغ پر اپنے رب کی برہان کا ایسا تسلط رکھتا ہے کہ خواہش نفس کبھی اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرماتا ہے، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری امت کی لغزش ہے۔ وہ راہ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

۶ ۔ اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا دلیل رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق و ہدایت سے ہوا کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسف کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلہ میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو بدی اور بے حیائی سے پاک کرنے، اور ان کی طہارت نفس کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے مصلحتِ الٰہی میں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے!" یوسف نے کہا "یہی مجھے پھسلا رہی تھی حالانکہ میں راضی نہ تھا:" اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا، اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔" جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری طاقت پرہیزگاری و تقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دے دیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎ اس سے معاملہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صاحب خانہ کے ساتھ خود اس عورت کے بھائی بندوں میں سے بھی کوئی شخص آرہا ہوگا اور اس نے یہ قضیہ سن کر کہا ہوگا کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت سے اس معاملہ کی یوں تحقیق کی جا سکتی ہے۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہادت پیش کرنے والا ایک شیر خوار بچہ تھا جو وہاں پنگھوڑے میں لیٹا ہوا تھا اور خدا نے اسے گویائی عطا کر کے اس سے یہ شہادت دلوائی۔ لیکن یہ روایت نہ تو کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور نہ اس معاملے میں خواہ مخواہ معجزے سے مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اس شاہد نے قرینے کی جس شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ سرا سر ایک معقول شہادت ہے اور اس کو دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک معاملہ فہم اور جہاندیدہ آدمی تھا جو صورت معاملہ کے سامنے آتے ہی اس کی تہ کو پہنچ گیا۔

؎ مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف کا قمیص سامنے سے پھٹا ہو تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ اقدام یوسف کی جانب سے تھا اور عورت اپنے آپ کو بچانے کی کشمکش کر رہی تھی۔ لیکن اگر یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عورت اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور یوسف اس سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ قرینے کی ایک اور شہادت بھی اس شہادت میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ اس شاہد نے توجہ صرف یوسف علیہ السلام کے قمیص کی طرف دلائی۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورت کے جسم یا اس کے لباس پر تشدد کی کوئی علامت سرے سے پائی ہی نہ جاتی تھی، حالانکہ اگر یہ مقدمہ اقدام زنا بالجبر کا ہوتا تو عورت پر اس کے کھلے آثار پائے جاتے۔

بائیبل اس اہم مضمون سے خالی ہے۔ البتہ تلمود کا بیان قرآن کے بیان سے بڑی حد تک متفق ہے۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف! اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطاکار تھی"۔ ۲

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے"۔ اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی[1] اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھ دی (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔ اور بے ساختہ پکار اٹھیں "حاشا للہ، یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا۔[2]" یوسف نے کہا "میرے رب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ قضیہ وہیں دروازے ہی پر چکا دیا گیا تھا اور عزیز مصر نے اپنی بیوی کو قصوروار پاکر اسے یوسف علیہ السلام سے معافی مانگنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن تلمود کی روایت یہ ہے کہ عزیز نے اپنی بیوی کی شکایت سن کر پہلے تو حضرت یوسف کو خوب پٹوایا، پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا، اور حکام عدالت نے حضرت یوسف کے قمیص کا جائزہ لے کر فیصلہ دیا کہ قصور عورت کا ہے۔ اب ہر شخص تھوڑے سے غور و تامل سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں سے کونسی روایت زیادہ معقول اور قرین قیاس ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اتنے بڑے ایک ذی وجاہت آدمی نے ایسے نازک معاملہ کو جو اس کی آبرو سے تعلق رکھتا تھا، عدالت میں پیش کرنا پسند کیا ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی ایسی مجلس جس میں مہمانوں کے لیے تکیے لگے ہوئے تھے۔ مصر کے آثار قدیمہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں تکیوں کا استعمال بہت ہوتا تھا

بائیبل میں اس ضیافت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر وہ قرآن سے بہت مختلف ہے۔ قرآن کے بیان میں جو زندگی، جو روح، جو فطریت اور جو اخلاقیت پائی جاتی ہے اس سے تلمود کا بیان بالکل خالی ہے۔

[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے

قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا[لـه]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) جن عورتوں کو بلایا ہوگا وہ امراء و رؤساء اور بڑے عہدہ داروں کے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی۔ ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوبصورت جوانی دکھا کر انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوان رعنا پر اگر میں مرمٹی تو آخر اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو بیگم عزیز نے کیا۔ پھر شریف خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو علانیہ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر میرا یہ غلام میرے ساتھ زنا کرنے پر راضی نہ ہوا تو میں اسے قید کرا دوں گی۔ یہ سب کچھ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یورپ اور امریکہ آج عورتوں کی جس آزادی و بے باکی کو بیسویں صدی کی ترقیات کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بہت پرانی چیز ہے۔ دقیانوس سے بھی سینکڑوں برس پہلے مصر میں یہ اسی شان کے ساتھ پائی جاتی تھی جیسی آج اس "روشن زمانے" میں پائی جا رہی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لـه یہ آیات ہمارے سامنے ان حالات کا ایک عجیب نقشہ پیش کرتی ہیں جن میں اس وقت حضرت یوسف مبتلا تھے۔ انیس بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو بدویانہ زندگی سے بہترین تندرستی اور بھری جوانی لیے ہوئے آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور جبری غلامی کے مراحل سے گزرنے کے بعد قسمت اسے دنیا کی سب سے بڑی متمدن سلطنت کے پایۂ تخت میں ایک بڑے رئیس کے ہاں لے آئی ہے۔ یہاں پہلے تو خود اس گھر کی بیگم ہی اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے جس سے اس کا شب و روز کا سابقہ ہے۔ پھر اس کے حسن کا چرچا سارے دارالسلطنت میں پھیلتا ہے اور شہر بھر کے امیر گھرانوں کی عورتیں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف سینکڑوں خوبصورت جال ہیں جو ہر وقت ہر جگہ اسے پھانسنے کے لیے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی تدبیریں اس کے جذبات کو بھڑکانے اور اس کے زہد کو توڑنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ جدھر جاتا ہے یہی دیکھتا ہے کہ گناہ اپنی ساری خوشنمائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا ہے۔ کوئی تو فجور کے مواقع خود ڈھونڈھتا ہے، مگر یہاں مواقع خود اس کو ڈھونڈ رہے ہیں اور اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ جس وقت بھی اس کے دل میں برائی کی طرف ادنیٰ میلان پیدا ہو وہ فوراً اپنے آپ کو اس کے

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں۔[ف۱] بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاکدامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[ف۲] ع ۴ ۴

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) سامنے پیش کر دیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے وہ اس خطرے میں بسر کر رہا ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ارادے کی بندش میں کچھ ڈھیل آجائے تو وہ گناہ کے ان بے شمار دروازوں میں سے کسی میں داخل ہو سکتا ہے جو اس کے انتظار میں کھلے ہوئے ہیں۔ اس نگری کا حال یہ ہے کہ:

شہریست پر ز خوباں وز ہر طرف نگارے یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

اس حالت میں یہ خدا پرست نوجوان جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتا ہے وہ بجائے خود کچھ کم قابل تعریف نہیں ہے، مگر ضبط نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عرفان نفس اور طہارت فکر کا مزید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی اس کے دل میں کبھی یہ متکبرانہ خیال نہیں آتا کہ واہ رے میں، کیسی مضبوط ہے میری سیرت کہ ایسی ایسی حسین اور جوان عورتیں میری گرویدہ ہیں اور پھر بھی میرے قدم نہیں پھسلتے۔ اس کے بجائے وہ اپنی بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کرتا ہے کہ اے رب، میں ایک کمزور انسان ہوں، میرا تنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں، تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا، ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں ——— درحقیقت یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ دیانت، امانت، عفت، حق شناسی، راست روی، انضباط، اور توازن ذہنی کی غیر معمولی صفات جو اب تک ان کے اندر چھپی ہوئی تھیں اور جن سے وہ خود بھی بے خبر تھے، وہ سب کی سب اس شدید آزمائش کے دور میں ابھر آئیں، پورے زور کے ساتھ کام کرنے لگیں، اور انھیں خود بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے اندر کون کون سی قوتیں موجود ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے سکتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [ف۱] دفع کرنا اس معنی میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کی سیرت صالحہ کو ایسی مضبوطی بخش دی گئی جس کے مقابلہ میں ان عورتوں کی ساری تدبیریں ناکام ہو کر رہ گئیں۔

[ف۲] اس طرح حضرت یوسف کا قید میں ڈالا جانا درحقیقت ان کی اخلاقی فتح اور مصر کے پورے طبقۂ امراء

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

قید خانہ میں دو[^۱] غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے[^۲]۔ ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں"۔ دوسرے نے کہا "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"[^۳]۔ یوسف نے کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) حکام کی اخلاقی شکست کا اتمام و اعلان تھا۔ اب حضرت یوسف کوئی غیر معروف اور گمنام آدمی نہ رہے تھے بلکہ ہیں، اور کم از کم دار السلطنت میں تو عام و خاص سب ان سے واقف ہو چکے تھے۔ جس شخص کی دل فریب شخصیت پر ایک دو نہیں، اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی خواتین فریفتہ ہوں، اور جس کے فتنۂ روزگار حسن سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی ہو کر اسے قید کر دیں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ضرور ہے کہ گھر گھر اس کا چرچا پھیل گیا ہو اور عام طور پر سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ یہ شخص کیسے بلند اور مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے اور یہ بھی کہ اسے جیل اپنے کسی جرم پر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ مصر کے امراء اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنے کے بجائے اس بے گناہ کو جیل بھیج دینا زیادہ آسان پاتے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [^۱] غالباً اس وقت جبکہ حضرت یوسف قید کیے گئے ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے نکل کر جب وہ مصر کے فرمانروا بنائے گئے تو ان کی عمر تیس سال کی تھی، اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں وہ بضع سنین یعنی کئی سال رہے۔ بضع کا اطلاق عربی زبان میں دس تک کے عدد کے لیے ہوتا ہے۔

[^۲] یہ دو غلام جو قید خانہ میں حضرت یوسف کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان کے متعلق بائیبل کی روایت ہے کہ ان میں سے ایک شاہِ مصر کے ساقیوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی نان بائیوں کا افسر۔ تلمود کا بیان ہے کہ ان دونوں کو شاہِ مصر نے اس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے ایک گلاس میں مکھی نکل آئی تھی۔

[^۳] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسف کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اوپر جن واقعات کا ذکر گزر چکا ہے ان کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات قابلِ تعجب نہیں رہتی کہ ان دو قیدیوں نے آخر حضرت یوسف ہی سے اگر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی اور ان کی خدمت میں یہ نذرِ عقیدت کیوں پیش کی کہ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔
(باقی صفحہ ۲۹ پر)

"یہاں جو کھانا تمھیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق، اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کے اختیارات اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اے زنداں کے ساتھیو! تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر) کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے۔"[۵۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس آدمی ہے۔ سخت ترین آزمائشوں میں وہ اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے کر آئے تھے۔ مصر کا بچہ بچہ جان چکا تھا کہ آج پورے ملک میں ان سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے حتیٰ کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں بھی ان کی نظیر مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ خود قید خانے کے حکام اور اہل کار بھی ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ چنانچہ بائیبل میں ہے کہ "قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسف کے ہاتھ میں سونپا اور جو کچھ وہ کرتے اسی کے حکم سے کرتے تھے، اور قید خانے کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے بے فکر تھا۔" (پیدائش ۳۹: ۲۲، ۲۳)

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۵ یہ تقریر جو اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے، بائیبل اور تلمود میں کہیں اس کی طرف ادنیٰ اشارہ تک نہیں ہے۔ وہ حضرت یوسف کو محض ایک دانشمند اور پرہیزگار آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ مگر قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی سیرت کے ان پہلوؤں کو بھی بائیبل اور تلمود کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن کر کے پیش کرتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنا ایک پیغمبرانہ مشن رکھتے تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ کا کام انھوں نے قید خانہ ہی میں شروع کر دیا تھا۔

یہ تقریر ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یونہی سرسری طور پر گذر جائیے۔ اس کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) یہ پہلا موقع ہے جبکہ حضرت یوسفؑ دین حق کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی داستان حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مرحلوں پر ابھرتی رہی ہیں تبلیغ کا کوئی نشان وہاں نہیں پایا جاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مراحل محض تیاری اور تربیت کے تھے۔ نبوت کا کام عملاً اب اس قید خانے کے مرحلے میں ان کے سپرد کیا گیا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر دعوت ہے۔

(۲) یہ بھی پہلا ہی موقع ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی۔ اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی۔ جب قافلے نے ان کو پکڑ کر غلام بنایا، جب وہ مصر میں لائے گئے، جب انھیں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا، جب انھیں جیل بھیجا گیا، ان میں سے کسی موقع پر بھی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کا پوتا اور یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ دادا کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے خواہ اہل مدین تھے یا اسماعیلی، دونوں ان کے ہم نسل ہی تھے۔ اہل مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیمؑ سے تو ناواقف نہ تھے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے کبھی اپنے باپ دادا کا نام لے کر اپنے آپ کو ان حالات سے نکالنے کی کوشش نہ کی جن میں وہ پچھلے چار پانچ سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انھیں بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ان کا ان حالات سے گذرنا ہی ضروری ہے۔ مگر اب انھوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوت توحید کی اس عالمگیر تحریک سے ہے جس کے ائمہ ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سوجھی تھی، بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں اس ازلی و ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام

(باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔

(۳) پھر حضرت یوسف نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا اس میں ہم کو حکمت تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمہیں ضرور بتا دوں گا مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ ان کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا۔ مگر جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اُس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے لیچڑ پن اور جھگڑالو پن سے انہیں الٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسف چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطۂ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہوگی، کیونکہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑ دو اور میرے دین میں آجاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو، اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہِ مصر) سے میرا ذکر کرنا۔" مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا۔[1] ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم اَن داتا، کسی کو خداوندِ نعمت، کسی کو مالکِ زمین اور کسی کو ربِّ دولت یا مختارِ صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب محض خالی خولی نام ہی ہیں، ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی و مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے جسے تم بھی کائنات کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو، ان میں سے کسی کے لیے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرمانروائی کے سارے اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(۵) اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف نے قید خانے کی زندگی کے یہ آٹھ دس سال کس طرح گذارے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چونکہ ان کے ایک ہی وعظ کا ذکر ہے اس لیے انھوں نے صرف ایک ہی دفعہ دعوتِ دین کے لیے زبان کھولی ہوگی۔ مگر اول تو ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان کرنا ہی سخت بدگمانی ہے کہ وہ اپنے اصل کام سے غافل ہوگا، پھر جس شخص کی تبلیغی دھن کا حال یہ تھا کہ دو آدمی تعبیرِ خواب پوچھتے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تبلیغ شروع کر دیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے قید خانے کے یہ چند سال خاموش ہی گذار دیے ہوں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] اس مقام کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ "شیطان نے حضرت یوسف کو اپنے رب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی یاد سے غافل کر دیا اور انھوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ اپنے رب (یعنی شاہ مصر) سے ان کا تذکرہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں پڑے رہے۔" درحقیقت یہ تفسیر بالکل غلط ہے۔ صحیح یہی ہے، جیسا کہ علامہ ابن کثیر، اور متقدمین میں سے مجاہد اور محمد ابن اسحاق وغیرہ نے کہا کہ فانساہ الشیطان ذکر ربہ کی ضمیر اس شخص کی طرف پھرتی ہے جس کے متعلق حضرت یوسف کا گمان تھا کہ وہ رہائی پانے والا ہے، اور اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ "شیطان نے اسے اپنے آقا سے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا۔" اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر یوسف علیہ السلام نے وہ بات نہ کہی ہوتی جو انھوں نے کہی تو وہ قید میں کئی سال نہ پڑے رہتے۔" لیکن علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جتنے طریقوں سے روایت کی گئی ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ بعض طریقوں سے یہ مرفوعاً روایت کی گئی ہے اور ان میں سفیان بن وکیع اور ابراہیم بن یزید راوی ہیں جو دونوں ناقابلِ اعتماد ہیں۔ اور بعض طریقوں سے یہ مرسلاً روایت ہوئی ہے اور ایسے معاملات میں مرسلات کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" علاوہ بریں درایت کے اعتبار سے بھی یہ بات باور کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ایک مظلوم شخص کا اپنی رہائی کے لیے دنیوی تدبیر کرنا خدا سے غفلت اور توکل کے فقدان کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔